بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب حامدا و مصليا

اگر کسی شخص کے پاس رہنے کیلئے کرایہ کا مکان موجود ہو، لیکن وہ ذاتی مکان خریدنا چاہتا ہے تو اس مقصد کیلئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ سود کی حرمت نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ البتہ اگر "ضرورتِ شدیدہ" پیش آجائے مثلاً کسی کے پاس سر چھپانے کیلئے بھی جگہ نہ ہو اور نہ اس کے پاس خریدنے کی استطاعت ہو، اور کوئی بلاسود قرض دینے پر بھی راضی نہ ہو اور نہ ہی کسی جائز طریقہ مثلاً کرایہ وغیرہ سے رہنے کیلئے مکان مل رہا ہو تو چونکہ سخت ضرورت کی حالت میں جس طرح دیگر محرّمات کے ارتکاب کی بقدرِ ضرورت اجازت ہوتی ہے اِسی طرح سودی قرض لیکر مکان خریدنے کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن صرف اس بنیاد پر کہ "مکان ذاتی نہیں اور زندگی بھر کرایہ ادا کرتے رہنے کی وجہ سے کچھ رقم پس انداز نہیں ہوسکے گی" سودی قرض لینے کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے جس کی وجہ سے ربوٰا محرّم کی اجازت دی جائے، اور نہ ہی یہ کوئی ایسی مضرّت ہے کہ سود دیئے بغیر دور کرنا ممکن نہ ہو، ہاں البتہ ذاتی گھر ہونا ایک حاجت ہے، لیکن یہ حاجت پوری کرنے کیلئے کسی حرام کے ارتکاب کی اجازت نہیں۔

البتہ اس کے متبادل کے طور پر مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے:

(الف) : ایک متبادل طریقہ تو وہی ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے فتاوٰی عثمانی میں تجویز فرمایا ہے کہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے سے گفت وشنید کے نتیجہ میں یہ طے کر لیا جائے کہ بینک پہلے خود قسطوں پر مکان خرید کر اس پر قبضہ کرلے، پھر خریدار کو قسطوں پر فروخت کردے اور مکان کی قیمت بازاری قیمت سے جتنی زیادہ مناسب سمجھے مقرر کرلے، معاملہ کرتے وقت اس مکان کی کُل قیمت اور قسطوں کا تعین کرلیا جائے۔ اس طرح خریدار کو مکان بھی مل جائے گا اور بینک اپنا نفع بھی رکھ لے گا۔ (فتاوٰی عثمانی: ۳/۳۱۰)

(ب): البتہ اگر بینک سے اس طرح معاملہ کرنا مشکل ہو تو اس کا دوسرا حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہاں کے مسلمان تاجر مل کر آپس میں ایک یونین اور ویلفئیر ٹرسٹ بنائیں جو کہ ایک شخص معنوی کی حیثیت سے اپنا مستقل شرعی وقانونی وجود رکھتا ہو، اور اس ٹرسٹ کے اصول وضوابط بھی طے کیے جائیں، اور ٹرسٹ کے ممبران ادارہ میں بطورِ مضاربت اپنی رقوم جمع کروائیں، ادارہ ان رقوم میں سے کچھ رقم کسی نفع بخش کاروبار میں لگائے اور بقیہ کچھ رقم

(جاری ہے۔۔۔)

سے کسی حاجتمند مسلمان کو مکان خرید کر "شرکتِ متناقصہ" کے طریقہ پر فروخت کردے، اس طرح کچھ عرصہ میں حاجتمند مسلمان جائز طریقہ سے گھر کا مالک ہوجائے گا، اور مسلمان تاجروں کو بھی مضاربت کا نفع ملے گا۔

(ج): تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہاں کے مسلمان اپنی زکوٰۃ وصدقات سے حاجتمند مسلمانوں کی مدد کریں، اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ:

(i): ذاتی گھر کیلئے حاجتمند شخص اگر اتنا غریب ہو کہ وہ شرعی لحاظ سے مستحقِ زکوٰۃ بھی ہو تو اس صورت میں مسلمان تاجر اپنی زکوٰۃ وصدقات کی رقوم جمع کر کے اُس مستحق شخص کو گھر خرید کر دے دیں، اس طرح مسلمان تاجروں کی زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی اور ایک حاجتمند شخص کی حاجت بھی پوری ہوجائے گی۔

(ii): اگر وہ شخص شرعی لحاظ سے مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے مثلاً اس کی ملکیت میں ضرورت سے زائد نصاب کے بقدر مال ہے لیکن گھر خریدنے کیلئے ناکافی ہے، تو اس صورت میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ گھر خرید کر بائع کی رضامندی سے تحریری طور پر یہ طے کرلے کہ مکان کی کچھ قیمت فوری ادا کی جائے گی اور بقیہ قیمت (مثلاً) کچھ دنوں بعد ادا کی جائے گی، (اس طرح مکان خریدنے کے بعد مکان کا ثمن اس کے ذمہ دَین ہوجائے گا جس کے نتیجہ میں وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوجائے گا) پھر جس حد تک رقم یہ شخص ادا کرسکتا ہو، کردے اور بقیہ قیمت دیگر مسلمان اپنی زکوٰۃ سے ادا کردیں وذٰلک یکون أداء الدین عن الفقیر بإذنہ

(د): چوتھی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر مذکورہ حاجتمند شخص مستحقِ زکوٰۃ نہ ہو تو مذکورہ شخص اور اس کے ساتھ کوئی ایک یا چند مسلم تاجر مل کر مکان خریدیں جس کے نتیجہ میں ان کی مکان میں شرکتِ ملک قائم ہوجائے گی۔ مکان خریدنے کے بعد مذکورہ شخص کے علاوہ خریداری میں شریک دیگر فرد یا افراد اپنا حصہ "مرابحہ مؤجلہ" یا "شرکتِ متناقصہ" کے طریقہ پر اِس شخص کو فروخت کردیں۔

(جاری ہے۔۔۔)

اب سوال کے ساتھ منسلکہ تحریر میں درج نکات کا جائزہ لیا جاتا ہے:

۱۔۔سوال کے ساتھ منسلکہ تحریر میں قنیہ کا جو جزئیہ ذکر کیا گیا ہے اس میں "محتاج" سے مراد اگر "مضطر" ہے، تب تو اس سے زیرِ بحث مسئلہ میں سودی قرض لینے کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ "ذاتی مکان نہ ہونا" اضطرار کی کیفیت میں داخل نہیں ہے، اور اگر مذکورہ جزئیہ میں "محتاج" سے یہ مراد لیا جائے کہ ضرورتِ شدیدہ کے علاوہ بوقتِ حاجت بھی سود پر قرض لیا جاسکتا ہے تو اس معنیٰ میں قنیہ کے مذکورہ جزئیہ سے استدلال مندرجہ ذیل دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہوگا:

(الف)۔۔۔یہ جزئیہ سود کی حرمت کے متعلق وارد نصوص کے خلاف ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ نصوصِ صریحہ کی مخالفت کی صورت میں اس جزئیہ کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

(ب)۔۔۔حاجت کی بنیاد پر کسی حکم شرعی میں تبدیلی کی دو شرطیں ہیں: (۱)۔۔قرآن وسنّت اور فقہاءِ کرامؒ کے کلام میں اس حاجت کا اعتبار کیا گیا ہو۔ (۲)۔۔اصل حکم صراحۃً قرآن وسنت میں منصوص نہ ہو، بلکہ محتمل ہو یا مجتہد فیہ ہو۔ باقی وہ مسائل جو منصوص قطعی اور غیر مجتہد فیہ ہیں، ان میں حاجت کی وجہ سے حکم شرعی میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ (کمافی اصول الافتاء وآدابہ: ص۲۷۱) اور ظاہر ہے کہ سود کی حرمت قطعی اور نصِ صریح سے ثابت ہے اور اس کی حرمت مجتہد فیہ بھی نہیں، (دار الحرب میں اگرچہ حضراتِ طرفین کے نزدیک سودی معاملہ کرنے کی گنجائش ہے لیکن در حقیقت انہوں نے اس بنیاد پر معاملہ کی اجازت دی ہے کہ دار الحرب میں حربی کا مال غیر معصوم اور غیر متقوم ہے اس لئے ان کا مال لینا گویا مباح مال قبضہ میں لے کر اس کا مالک بننا ہے، در حقیقت یہ ربوا کا معاملہ ہے ہی نہیں، کمافی بدائع الصنائع) اس لئے حاجت کی بنیاد پر سودی معاملہ کی اجازت نہیں۔

لہٰذا نصوصِ قطعیہ اور مذکورہ جزئیہ کے درمیان تطبیق کا تقاضا یہی ہے کہ قنیہ کے اس جزئیہ کو "مضطر" پر محمول کیا جائے، ورنہ بصورتِ دیگر اس جزئیہ کی بنیاد پر حاجتوں کے پورا کرنے کیلئے سودی قرض کا دروازہ کھل جائے گا، جس کی قباحت کسی صاحبِ عقل سے مخفی نہیں۔ ہمارے اکابرؒ کے فتاویٰ میں سے کفایت المفتی میں بھی مجبوری کی تفسیر "اضطرار" سے کی گئی ہے۔

کفایت المفتی (۱۱/۱۹۱):

سوال: سود پر روپیہ قرض لینا حالتِ مجبوری میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سود پر روپیہ قرض لینا جائز نہیں، اِلّا یہ کہ اضطراری حالت ہو جائے۔

(جاری ہے۔۔۔)

۲۔۔۔جہاں تک بعض عرب علماء کے ''المشقة تجلب التيسير '' اور'' الحرج مدفوع '' کی بنیاد پر جواز کے فتویٰ کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اور مشقت کا وہاں اعتبار ہوتا ہے جہاں کوئی نص نہ ہو، لیکن جہاں نص موجود ہو تو اس نص کے خلاف کرتے ہوئے حرج اور مشقت کو دور نہیں کیا جائے گا، اِسی طرح جہاں نص موجود ہو وہاں خلافِ نص عمومِ بلویٰ کا بھی اعتبار نہیں ہو گا کما فی الاشباہ:المشقة والحرج إنما يعتبران في موضع لا نص فيه وأما مع النص بخلافه فلا......وقال في الأنجاس إن الإمام يقول بتغليظ نجاسة الأرواث لقوله عليه السلام إنما ركس أي نجس ولا اعتبار عنده بالبلوى في موضع النص كما في بول الآدمي : فإن البلوى فيه أعم انتهى،(الاشباہ والنظائر لابن نجیم: 1/104)

اور سود کی حرمت پر چونکہ نصِ صریح موجود ہے، اس لئے اگر سود سے بچنے میں مشقت اور حرج ہو تب بھی اسے برداشت کیا جائے گا، اس حرج سے بچنے کیلئے سودی معاملہ کی اجازت نہ ہو گی، اِلّا فی موقع الضرورة

۳۔۔۔جہاں تک ''موسوعۃ فقہیۃ'' کے اس جزئیہ کا تعلق ہے جس میں ''اعطاء الربوٰ'' کو ''اعطاء الرشوۃ'' کے ساتھ ملحق کیا ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ موسوعۃ فقہیۃ کا یہ جزئیہ در حقیقت اُس قاعدہ کا نتیجہ ہے جو ''الاشباہ والنظائر'' اور ''المنثور فی القواعد للزرکشی'' میں بیان کیا گیا ہے اور وہ قاعدہ ہے ''ماحرم أخذه حرم إعطاؤه '' یعنی جو چیز لینا حرام ہے وہ کسی اور کو دینا بھی حرام ہے، جیسے رشوت، سود وغیرہ، پھر رشوت کی کچھ استثنائی صورتیں ذکر کی گئی ہیں جن میں رشوت دینے کی گنجائش ہے، لیکن لینے والے کیلئے بہر حال لینا حرام ہے، ان عبارات میں صرف اتنی بات یعنی اعطاءِ رشوت کی استثنائی صورت مذکور ہے، ''ربا'' کی کوئی استثنائی صورت ذکر نہیں کی گئی تھی جبکہ مثالوں میں ربا کا ذکر بھی موجود تھا، اس لئے بعد میں آنے والوں نے نتائج اخذ کرتے ہوئے ربا کی استثنائی صورت کو بھی ذکر فرمایا، چنانچہ موسوعۃ فقہیۃ میں اس کا نتیجہ یہ ذکر کیا گیا کہ:

وينبغي أن يكون مثله إعطاء الربا للضرورة فيأثم المقرض دون المقترض .

کہ جس طرح ضرورت کی وجہ سے رشوت دینے کی گنجائش ہے اِسی طرح ضرورت کی وجہ سے سود دینا بھی جائز ہے۔

لیکن واضح رہے کہ اس عبارت میں بھی صرف ''ضرورت'' کی بنیاد پر سود دینے کی گنجائش بیان فرمائی گئی ہے، حاجت کیلئے سود دینے کی گنجائش یہاں مذکور نہیں، اس کی تائید علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے کلام سے بھی ہوتی ہے:

(جاری ہے۔۔۔)

قلت: و قد قالت الفقهاء بجواز اعطاء الرشوة للمضطر لدفع مضرة لا تندفع الّا باعطائها ، و اما اخذ الرشوة فلا يجوز بحال، والربا والرشوة من باب واحد، فمقتضاه ان يجوز اعطاء الربا للمضطر لدفع مضرة لاتندفع الا باعطائه، و اما اخذ الربا فلا يجوز اصلا، و هٰذا وجه أخر فارق بين اخذ الربا و اعطائه، فالاول حرام فی کل حال ، والثانی حرام یسقط حرمته عند الاضطرار، و اما جواز اخذ الربوا للمسلم من الحربی فتسمیته بالربا مجاز، والّا فهو لیس من الربوا عند القائل بجوازه، واللہ سبحانه وتعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفی عنه، (امداد الاحکام:487/3)

۴۔۔۔جہاں تک جدید فقہی مسائل کا تعلق ہے جس میں حاجت کی وجہ سے سودی قرض لینے کی اجازت دی گئی ہے تو سیاق وسباق دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بھی جواز کی بنیاد در حقیقت "قنیہ" کا مذکورہ جزئیہ اور عمومِ بلوٰی، اور دفعِ مشقت ہے، جس کا جواب اوپر گذر چکا ہے۔ نیز اس میں اشباہ کے جزئیہ "الحاجة تنزلمنزلة الضرورة" کو بھی بنیاد بنایا گیا ہے، لیکن اس قاعدہ کی بنیاد پر بھی کسی منصوص قطعی حکم میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے "اصول الافتاء وآدابہ" میں اس پر کلام فرمایا ہے۔

۵۔۔۔جہاں تک "المجلس الاروبی للافتاء والبحوث" کے فتویٰ کا تعلق ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اس فتوی میں جواز کی بنیاد دو باتوں پر رکھی گئی ہے:

۱۔۔فقہ کا مشہور قاعدہ ہے "الضرورات تبیح المحظورات" اور "الحاجة تنزلمنزلة الضرورة"۔

۲۔۔دار الاسلام میں حضراتِ طرفینؒ کے مسلک کے مطابق عقودِ فاسدہ (جن میں سودی معاملہ بھی شامل ہے) کا جواز۔

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "گھر" یعنی انسان کے پاس رہنے کیلئے فی نفسہٖ جگہ ہونا "ضرورت" میں داخل ہے، لیکن یہ ضرورت تو ذاتی گھر کے علاوہ کرائے کے مکان سے بھی پوری ہو جاتی ہے، لہٰذا "گھر کا ذاتی ہونا" ایسی ضرورت نہیں جس کی وجہ سے سود دینے کو جائز قرار دیا جائے، لہٰذا الضرورات تبیح المحظورات والا قاعدہ یہاں جاری نہ ہوگا۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضراتِ طرفین کے نزدیک دار الحرب میں عقودِ فاسدہ کی اجازت ہے لیکن یہ قول مفتیٰ بہ نہیں ہے، (لہذا مجلس افتاء کے فتوی میں اس قول کو جو مفتیٰ بہ کہا گیا ہے وہ درست نہیں) بلکہ مفتیٰ بہ قول دار الحرب میں بھی سودی لین ودین کے عدم جواز کا ہے، اور محققین اکابر علماءِ کرام نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ (جاری ہے---) لئے حضراتِ طرفینؒ کے قول کو بنیاد بنا کر ذاتی گھر خریدنے کیلئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، البتہ اگر کوئی واقعی ایسی ضرورت ہو جو شرعاً بھی "ضرورت" شمار ہوتی ہو تو مستند اہل افتاء کی رائے سے اس قول پر بھی عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مجلس کے اس فتوٰی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سود ایک معاشرتی معاملہ ہے، اور مسلمان شخصی احکام مثلاً عبادات، مطعومات، مشروبات، ملبوسات، نکاح، طلاق، عدت ومیراث وغیرہ کے مسائل کے پورا کرنے کا پابند ہے، باقی شریعت کے تمدنی، مالی اور سیاسی احکام معاشرے میں قائم کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ یہ بات بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ سود کا معاملہ صرف معاشرتی معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حرمت نصوصِ قطعیہ سے ثابت اور ہر مسلمان شخص اس سے بچنے کا مکلف ہے، اگر معاشرے میں سودی لین ودین ہو رہا ہو اور مسلمان اس پر نکیر کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود بھی اس معاملہ میں شامل ہو جائے، لہٰذا مسلمان پر اپنی ذات کی حد تک تو ہر حال میں سودی معاملہ سے بچنے کی کوشش کرنا لازم ہے۔

مجلس کے اس فتوٰی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمان اگر وہاں سودی معاملہ نہ کرے تو اس کا مسلمان ہونا اس کی معاشی بدحالی اور مالی نقصان کا ذریعہ بن جائے گا، کیونکہ اس کو ان لوگوں کے قوانین اپنے معاملات میں نافذ کرنے پڑیں گے، جب ان کی طرف سے کچھ مطالبہ ہو گا تو اس کو دینا پڑے گا، لیکن جب اس کے لینے کا وقت آئے گا تو اسلامی احکام کی وجہ سے نہ لے سکے گا، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سراسر نقصان ہو گا، حالانکہ الاسلام یزید ولا ینقص ---الخ۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تب بھی اس سے زیرِ بحث مسئلہ پر استدلال اس وقت ممکن ہو تا جب مسلمان ان سے سود لے کر فائدہ حاصل کرتا، لیکن صورتِ مسئولہ میں تو مسلمان کو سود دینا پڑے گا جس میں مسلمان کا نقصان ہے، اس لئے اس بنیاد پر بھی سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مجلس کے فتوی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ " ربا کی اصل حرمت کھانے سے متعلق ہے، کھلانے کی حرمت سدِ ذریعہ کے طور پر ہے، اور بوقتِ حاجت سود دیا جاسکتا ہے"، اس کے متعلق عرض ہے کہ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ

درست ہے کہ سود کھانے کی حرمت وشناعت سود کھلانے کی بنسبت زیادہ ہے لما فیه من التمتع بالحرام، لیکن گناہ میں فرقِ مراتب کے باوجود نفسِ حرمت میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ ایک سوال (سود لینے والے اور دینے والے دونوں پر عذاب برابر ہو گا یا کچھ فرق ہو گا؟) کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: اطلاقِ حدیث سے تو دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: قال " لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" رواه مسلم مگر شراحِ حدیث کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ مقدارِ گناہ میں تفاوت ہے، اگرچہ نفسِ گناہ میں دونوں شریک ہیں کما فی المرقاۃ تحت الحدیث المذکور فی الإثم وان کانوا مختلفین فی قدرہ الخ، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دینے والے کو تو صرف دینے کا گناہ ہو گا اور لینے والے کو لینے کا بھی اور اس کے صَرف واستعمال کا بھی، یا یہ کہ دینے والے کو بنسبت لینے والے کے کچھ اضطرار ہے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال، لیکن جب دونوں میں گناہ ہے تو اب کم وزائد ہونے سے کچھ حرمت تو زائل نہیں ہوتی، جیسا کہ پائخانہ بھی گندہ ہے اور پیشاب بھی گندہ ہے، اگرچہ ایک دوسرے سے زیادہ گندہ ہے مگر گندگی دونوں میں ہے، سب سے بچنا چاہئے۔
(امداد الفتاوی: ۳/۱۶۴)

لہٰذا جس طرح سود لینا حرام ہے اِسی طرح سود دینا بھی فی نفسہٖ حرام ہے، اور ظاہر ہے کہ حاجت کی بنیاد پر ارتکابِ حرام کی اجازت نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس رہنے کیلئے کوئی جگہ ہو، خواہ وہ کرایہ کی ہی کیوں نہ ہو تو ایسے شخص کیلئے ذاتی گھر خریدنے کیلئے سودی قرض لینا جائز نہیں، البتہ اس کے متبادل کے طور پر تجویز کردہ جائز طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

بدائع الصنائع – (5 / 192)(فصل وأما شرائط جريان الربا)

ولهما أن مال الحربي ليس بمعصوم بل هو مباح في نفسه إلا أن المسلم المستأمن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة فإذا بدله باختياره ورضاه فقد زال هذا المعنى فكان الأخذ استيلاء على مال مباح غير مملوك وأنه مشروع مفيد للملك كالاستيلاء على الحطب والحشيش وبه تبين أن العقد ههنا ليس بتملك بل هو تحصيل شرط التملك وهو الرضا لأن ملك الحربي لا يزول بدونه وما لم يزل ملكه لا يقع الأخذ تملكا لكنه إذا زال

(جاری ہے۔۔۔)

فالملك للمسلم يثبت بالأخذ والاستيلاء لا بالعقد فلا يتحقق الربا لأن الربا
اسم لفضل يستفاد بالعقد

الأشباه والنظائر – حنفي – (1 /182)

القاعدة الرابعة عشرة : ما حرم أخذه حرم إعطاؤه
كالربا و مهر البغي و حلوان الكاهن و الرشوة و أجرة النائحة و الزامر إلا في
مسائل : الرشوة لخوف على نفسه أو ماله أو ليسوي أمره عند السلطان أو
أمير إلا للقاضي فإنه يحرم الأخذ و الإعطاء كما بيناه في شرح الكنز من
القضاء وفك الأسير و إعطاء شيء لمن يخاف هجوه

غمز عيون البصائر – (1 / 449)

قوله الرشوة لخوف على ماله إلخ
هذا في جانب الدافع أما في جانب المدفوع له فحرام ولم ينبه عليه كذا قيل
أقول إنما لم ينبه عليه لظهوره إذ لا ضرورة في جانب المدفوع له وينبغي أن
يستثنى الأخذ بالربا للمحتاج فإنه لا يحرم كما صرح به المصنف رحمه الله في
البحر ويحرم على الدافع الإعطاء بالربا

المنثور في القواعد – الزركشي – (3 / 140)

ما حرم على الاخذ أخذه حرم على المعطى إعطائه
كأجرة النائحة والزمار والرشوة للحاكم إذا بذلها ليحكم له بغير الحق ويستثنى
صور لا تحرم على الدافع وان حرم على الاخذ كالرشوة للحاكم ليصل إلى
حقه وكفك الأسير واعطاء شيء لمن يخاف هجوه

الموسوعة الفقهية الكويتية – (6 / 166)

وفي الأشباه لابن نجيم ، ومثله في المنثور للزركشي : ما حرم أخذه حرم
إعطاؤه ، كالربا ومهر البغي وحلوان الكاهن والرشوة للحاكم إذا بذلها ليحكم
له بغير الحق ، إلا في مسائل في الرشوة لخوف على نفسه أو ماله أو لفك
أسير أو لمن يخافهجوه . (1) وينبغي أن يكون مثله إعطاء الربا للضرورة فيأثم
المقرض دون المقترض.

الأشباه والنظائر – حنفي – (1 / 104)

المشقة والحرج إنما يعتبران عند عدم النص

الفائدة الثالثة : المشقة والحرج إنما يعتبران في موضع لا نص فيه وأما مع النص بخلافه فلا ولذا قال أبو حنيفة و محمد رحمهما الله بحرمة رعي حشيش الحرم وقطعه إلا الإذخر وجوز أبو يوسف رحمه الله رعيه للحرج ورد عليه بما ذكرناه وذكره الزيلعي في جنايات الإحرام وقال في الأنجاس إن الإمام يقول بتغليظ نجاسة الأرواث لقوله عليه السلام إنها ركس أي نجس ولا اعتبار عنده بالبلوى في موضع النص كما في بول الآدمي : فإن البلوى فيه أعم انتهى وفي شرح منية المصلي : من المتأخرين من زاد في تفسير الغليظة على قول أبي حنيفة رحمه الله ولا حرج في اجتنابه كما في الاختيار وفي الغليظة على قولهما ولا بلوى في إصابته كما في الاختيار أيضا وفي المحيط : وهي زيادة حسنة يشهد لها بعض فروع الباب والمراد بقوله : ولا حرج في اجتنابه ولا بلوى في إصابته على اختلاف العبارتين إنما هو بالنسبة إلى جنس المكتفين فيقع الاتفاق على صدق القضية المشهورة وهي : إن ما عمت بليته خفت قضيته انتهى

(جاری ہے۔۔۔)

عمدة القاري شرح صحيح البخاري - (30 / 277)

والموكل المطعم والآكل الآخذ وإنما سوى في الإثم بينهما وإن كان أحدهما رابحا والآخر خاسرا لأنهما في فعل الحرام شريكان متعاونان

مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - (9 / 294)

قال الخطابي سوى رسول الله بين آكل الربا وموكله إذ كل لا يتوصل إلى أكله إلا بمعاونته ومشاركته إياه فهما شريكان في الإثم كما كانا شريكين في الفعل وإن كان أحدهما مغتبطا بفعله لما يستفضله من البيع والآخر منهضما لما يلحقه من النقص ولله عز وجل حدود فلا تتجاوز في وقت الوجود من الربح والعدم وعند العسر واليسر والضرورة لا تلحقه بوجه في أن يوكله الربا لأنه قد يجد السبيل إلى أن يتوصل إلى حاجته بوجه من وجوه المعاملة والمبايعة ونحوها قال الطيبي رحمه الله لعل هذا الاضطرار يلحق بالموكل فينبغي أن يحترز عن صريح الربا فيثبت بوجه من وجوه المبايعة لقوله تعالى وأحل الله البيع وحرم الربا البقرة لكن مع وجل وخوف شديد عسى الله أن يتجاوز عنه ولا كذلك الآكل وكاتبه وشاهده قال النووي فيه تصريح بتحريم كتابة المترابيين والشهادة عليهما بتحريم الإعانة على الباطل وقال أي النبي هم سواء أي في أصل الإثم وإن كانوا مختلفين في قدره

تكملةفتح الملهم (١/٥٧٤): باب لعن آكل الربا و مؤكله

قوله:(ومؤكله) يعنى : الذى يودى الربا إلى غيره، فإثم عقد الربا والتعامل به سواء فى كل من الآخذ والمعطى، ثم أخذ الربا أشد من الإعطاء، لما فيه من التمتع بالحرام، ولهذا جاز إعطاءه عند الضرورة الشديدة، كما فى شرح الأشباه للحموى وغيره (جاری ہے۔۔۔)

فى اصول الافتاء وآدابه:(ص: ٢٧٠ تا ٢٧٣)للشيخ المفتى محمد تقى العثمانى حفظه الله تعالىٰ

اما الحاجةفهيالداعيةالتييترتبعليعدمالاستجابةلهاضيقوحرجوعسروصعوبة،وانلميكنذلكالح رجيؤديالیتلفالنفساوالمال،ثمالحاجةعليقسمين :

حاجةعامة،وحاجةخاصة،اماالحاجةالعامةفمايحتاجاليهاالناسجميعااواكثرهم،والحاجة الخاصةمايحتاج اليها فئة منالناس،كأهلمدين ة معين ة أوأربابحرف ة معينة،أويحتاجإليهافردأوأفرادمحصورون، وقدقرّرالفقهاءانالحاج ة العام ة أو الخاصة ربماتؤثرفيتغييرالاحكاموجلبالتيسيركتأثيرالضرورة،ولمأرفيشئيمنكتبالفق همنأوضحوج ه الفرقبينتأثيرالضرورة وتأثير الحاجة ولكنالذييظهرلهذاالعبدالضعيفعفاالله عنهانالحاج ة إنماتعتبرمؤثرة فيتشريعبعضالاحكامالشرعية أوفيتغييرهافى حالتين:

الحالة الاولىٰ: أن تكون نصوص القرآن والسنة صرّحتبنفسهاباعتبارتلكالحاج ة،وذلكمثلجوازالسلم،فإنالسلمفيالاصلبيعمعدومو هولا يجوز، وإنما شرع السلم دفعاً لحاجة الناس،وقدنطقبإباحتهالقرآنوالسنة، وكذلك ابيح لبس الحرير للرجال فى الحرب والمرض ، وقد صرح به الحديثالنبويالشريف، ويلحقبهذهالحالة ماصرحالفقهاءباعتبارهفى الاحكام ، مثل فسخ الاجارة بالأعذارأوبقاءهاللحاج ة،وقدذكرالأتاسيرحمهالله تعالیٰأمثلة كثيرة من هٰذاالنوعتحتقاعدة: ‘‘ المشقة تجلبالتيسير’’۔

والحالة الثانية: أنيكون أصلالحكممحتملاغيرصريحفيالكتابوالسن ة،أومجتهدافيهفترجحالإباحة فيمواضعالحاجة،ذلكمثلكشفالمرأة عن وجهها،فانهلايجوزفيالاصل،ولكنحكمالاصل هذامبنيعلىنصوصمح تملة غيرصريحة، ولذلک اصبحت المسئلة مجته دافيها،وأجازه بعضالفق هاء ، فإن جانب الإجازة وإنكانمرجوحافينفسالأمر،غيرأن ه يرجحفيمواضعالحاج ة،ولذلكأفتيفقهاءالحنفية بجوازكشفالوج هللمرأ ة عند أداء الشه ادة،وعندالازدحامالشديدالتيلاتتمكنالمرأ ة مع ه المشيفيالطريقعندأداءالحج ۔أمافيالمسائللمنصوص ة القطعی ة التيليست محل

(جاری ہے۔۔۔)

اجتهاد، فالظاهر أن الحاجة لاتؤثر فيها إلا إذا بلغت مرتبة الضرورة ـ وقد ذكر بعض الفقهاء أن الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة[1]، وذلك وراء هذه القاعدة عامجدا، حتى أن هذا اشتبه على بعض الناس أن الحاجة مؤثرة في تحليل بعض المحرمات القطعية، مثلاً كالميتة والخنزير في حالة الاضطرار، ولكن الدليل هو من الأمثلة التي ذكرها الفقهاء تحت هذه القاعدة أن هذا ليس بمراد، وإلا لجاز كل محرم قطعي استدلالاً بأن الحاجة ولو كانت خاصة تقتضي ذلك، وهذا يؤدي إلى انحلال ربقة الشريعة بأسرها، ولكن المقصود منه ذه القاعدة بيان حكمة بعض الأحكام التي ثبتت إما بالنصوص، أو بالتعامل المستمر خلاف القياس، مثل بيع السلم والإجارة والاستصناع وغيرها، فإن هذه العقود إنما شرعت خلاف أصل القياس الظاهر، لأنها تشتمل على بيع المعدوم، ولكن الشريعة استثنت هذه العقود من حكم بيع المعدوم لحاجة الناس، فهذا يدل على أن الشريعة الغراء قد راعت في احكامها حاجة الناس، فأباحت كثيرا من العقود لإنجاز حاجاتهم ـ وما ذكرناه يتضح بالأمثلة التي ذكرها الفقهاء الذين ذكروا هذه القاعدة، فإنهم لم يوردوا حكماً إلا وهو ثابت إما بالكتاب والسنة، أو بالتعامل ـ فثبت بذلك أن تنزيل الحاجة منزلة الضرورة في بعض الأحكام لابد له من دليل شرعي آخر، مثلاً أن يرد به نص، أو يثبت الحكم بالعرف والتعامل، وليس المراد أن يثبت به حكم معارض لنص قطعي ـ

والذي يبدو لهذا العبد الضعيف عفا الله عنه أن هذه القاعدة فيها نظر من وجوه:

الاول: أننا لو أخذنا القاعدة بظاهرها، لم يكن هناك فرق بين الضرورة والحاجة مع أنهما خلافاً لما اتفق عليها الجميع ـ

الثاني: أن الضرورة المصطلحة فقهاً إنما ترخص في عمل محرم رخصة موقتة بقدر الضرورة، كما هو مصرح في قول الله سبحانه :(غير باغ ولا عاد)، مع أن الأمور التي ذكروا إباحتها تنزيلاً للحاجة منزلة الضرورة ليست موقتة، بل هي احكام دائمة لاتتقيد بوقت مثل جواز السلم أو الاستصناع وغيرهما، فكيف يقال إن الحاجة إليها نزلت منزلة الضرورة في جميع أحكامها ـ

الثالث: الأمثلة التي ذكرت تحت هذه القاعدة كلها مستندة إلى نص أو تعامل، وما ذكروا من الأمثلة التي لم تثبت بنص، مثل الجواز للمحتاج أن يستقرض بالربا، فإنها لا يباح له ذلك إلا في حالة الاضطرار، فيندرج تحت الضرورة المصطلحة دون الحاجة المحضة ـ وكذلك قد ذكر ابن

(جاری ہے---)

نجیمرحمهاللهتعالیٰجوازبیعالوفاءتحت

هذهالقاعدة،ولکنهأولامختلففیه،وثانیا :منأجازهإنماأجازهعلیأنالش رط المتعارف لا یفسد العقد۔

ولذلک قال الشیخ أحمد الزرقاء رحم هاللهتعالیفیشرح

هذهالقاعدة :"والظاهرأنمایجوزللحاجةإنمایجوزفیماوردفیهنصیجوّزهأوتعاملأ و لم یرد فیهشئیمنهماولکنلمیردفیهنصیمنعهبخصوصهوکانلهنظیرفیالشرع یمکن الحاقهبهوجعلماورد فی نظیرهواردافیه"............. **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب**

محمد حذیفہ عفااللہ عنہ

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

۲۸۔صفر المظفر۔۱۴۳۵ھ

یکم۔جنوری۔۲۰۱۴ء

یہ جواب بندے کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، اور بندے کے خیال میں درست ہے۔ اس رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ واللہ سبحانہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۸۔۲۔۳۵ھ